

قرآن اور علاجِ حزن

ڈاکٹر میر ولی الدین

بے خلیشا زمیستن نازیستن باید آتش در تہِ پارِ یستن
بستینِ این گو نہ تقدیرِ خودی است از ہمیں تقدیرِ تعمیرِ خودی است

(امتحان و آزمائش کے بغیر جینا جینا ہی نہیں ہے۔ پاؤں تلے آگ لگا کر جینا زندگی ہے، اس طرح کی زندگی خودی کی تقدیر ہے اور اسی تقدیر سے خودی کی تعمیر ہے۔)

ابتلاء یا آزمائش انسان کی تقدیر ہے اور ابتلاء ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزوں کے روک لیے جانے یا فنا کر دیے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول میں مشکلات کے پیدا ہونے سے، خلش سے، درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہو خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے اور ابتلا کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی پختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توقیر ہوتی ہے، خاص و عام زہمتوں اور راحتوں کا نزول ہوتا ہے اور جو شخص ابتلا سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی دو جوبی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے اور نادانستہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہیں چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہیں چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ:

دوامِ مازِ سوزِ ناتمام است جوہای جز تپش برما حرام است
مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل تپید یک دم دمرگِ دوام است

(سوز و گداز کے بغیر ہمارا دوام ناقص ہے، مچھلی کی طرح تڑپنے کے علاوہ سب کچھ ہم پر حرام ہے۔ اس ساحل کو تلاش نہ کرو جو ساحل کے آغوش میں تڑپتا ہے اور ہمیشہ کے لیے ساکن ہو جاتا ہے)

اپنے اس دعوے کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لیے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں اور کائنات و فطرت انسانی کے چند کلی و جزوی قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتے ہیں: یک ہتھیہٴ دماغی باید کرد! ایک بار دماغ کی صفائی کرنا چاہیے۔

انسان، احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقید ہی سے احتیاج پیدا ہوتی ہے یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ حاجت مند ہے، فقیر ہے اور درد نتیجہ ہے اسی فقر و احتیاج کا اور فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے:

عالم ہمہ در دست و دوا میخواید از خوان کرم برگ و نوا میخواید
 کس بے حاجت نمی تواند دیدن درویش غذاشته اشتہا میخواید
 (سارا جہاں درد سے بھرا ہے اور دوا کا طلب گار ہے۔ سخاوت کے دسترخوان سے پتا اور نوا مانگتا ہے کوئی بھی ضرورت کے
 بغیر فقیر کو نہیں دیکھ سکتا ہے کیوں کہ اس کو بھی کھانے کی خواہش ہے۔)

عالم اسباب و علل میں جس کی تشبیہ انگارہ سے دی جاسکتی ہے، مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد
 تک دور کیے جاسکتے ہیں جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل
 سے علاحدہ ہو کر نافع نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم انہیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوے کی تائید
 کریں گے۔

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت میں داخل ہیں،
 کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایقان ہے کہ کائنات کا مبداء حق تعالیٰ ہیں جو حکمت و
 خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہیں، وہی اس کائنات پر حکمراں ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت انہی کی نافذ ہو رہی
 ہے، لہذا یہ کائنات مظہر ہے خیر و حکمت کا، پھر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے اور ہر رنگ میں انسان جو جلتا
 رہتا ہے، اس میں کون سی حکمت ہے اور خیر کا کون سا نمایاں پہلو ہے؟ ان ہی واقفان راز کا بیان ہے کہ اہل ذکر یا مشاہدہ
 پر اس کی حکمت مبرہن ہے۔ اس کی توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش کی جاسکتی ہے۔

① درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے، جرم و معصیت کا، گناہ و بد کرداری کا، ذمائم اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے افعال
 و اعمال کا، اس راز کو قرآن حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے: ﴿مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ
 وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ﴾۔ (پ ۲۴، آیت ۵) ﴿تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں
 سے ہے اور بہت سے تو درگزر ہی کر دیتا ہے۔﴾

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے: ﴿وَأُولَٰئِكَ أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدِ اصْبَحْتُمْ مِثْلِيهَا
 قُلْتُمْ إِنِّي هَذَا قُلْتُ هُوَ مِنْ عِنْدِ انْفُسِكُمْ﴾ اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس سے دو چند پہنچا چکے ہو، تو
 کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی۔ آپ فرمادیجیے کہ یہ تکلیف تم کو تمہاری طرف سے پہنچی۔

صاحب کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ: ”انما ہی اعمالکم ترد علیکم“ یہ
 تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں، قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کر کے حکماء و صوفیائے اسلام نے یہ
 اصول قرار دے لیا ہے کہ: ان جمیع الوجود بقا بلکم بحسب ما برز منکم من الاعمال فانظروا کیف
 تكونون فان الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامة (شیخ ابوالنجاء)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسا ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے، اس لیے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا، کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا اور اگریدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہوگا جس نے توقع کی ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا ہو تو اس نے محال کی تمنا کی۔ من طلب استقامة الظل مع عوج الشاخص فقد۔ رام المحال۔ اس لیے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھائے جا رہا ہے یہ نتیجہ ہے تمہارے ہی اعمال بد کا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ تکلیف دے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے کہ فوراً یاد نہ آئے، لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائے گا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار سے کام لیا جائے اور دیناً و فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے کہ اللوم علی لا علیہم ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیوں کہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن میری ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں۔ ع: زادہ طبع من اندا ناکہ خصمان من اند (خاتانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگے گا کہ ”اعدی عدوک نفسک النبی یسن جنبیک“ تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے اور دالم تیرے ہی ہاتھوں کی کمانی ہے۔ یداک کسبتا وفوک نفع۔ جو مصیبت و آفت، درد و غم، گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے کہ انسان نزولاً بل پر صبر نہیں کرتا، اپنی جیسی بے بس و بے کس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جزع و فزع کرتا ہے، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، مقام شکوی میں داخل ہو جاتا ہے اور مقام صبر سے خارج ہو جاتا ہے، مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا وہاہم باطلہ سے تخلیہ کرے، خیر کی جانب لوٹے، نوری طرف پلے ظلمتوں سے نکل جائے، غم و الم کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائیں گی اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگے گا۔

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں، ان کا وجود اس پر اسرار کائنات میں بے معنی نہیں، شرمض نہیں، یہ خیر کے تحقیق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لے جانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں کہو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کے لیے ضروری ہیں، اقبال نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

جہان ما کہ جز انگارہ نیست اسیر انقلاب صبح و شام است
ز سوبان قضا ہموار گردد ہنوز اس پیکر گل ناتمام است

(ہمارا جہاں جو صرف انگارے پر مشتمل ہے صبح و شام کے انقلابات کا قیدی ہے۔ قضاء کی سواہان (ریتی) سے ٹھیک ہو جاتا ہے اب تک مٹی کا یہ گارہ ناکمل ہے۔)

سواہان قضاء بیکرِ خاک کی نقص و تحدید کو، کبھی و خا می کو غم و الم کے انگارہ سے دور کرتا جاتا ہے اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے!

• بعض دفعہ درد و الم، سوز و غم، معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں عائد کیے جانے مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکفیر و تجمیص ہوتی ہے، شہوتوں اور لذتوں کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامر الہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، درد و غم، سوز و الم نفس سے ظلمتوں کو رفع کرتے ہیں، وہ ان کی طرف رخ کر کے نورانی ہو جاتا ہے اور گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے۔ ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان سے جڑ جاتا ہے، ربط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ موثر تطہیر کے لیے کوئی اور شے نہیں اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر۔ ع: ایں بلائے دوست تطہیر شام است۔ (دوست کی یہ مصیبت آپ کی پاکیزگی کے لیے ہے۔) (رومی)۔

اسی مقصود کو پیش نظر رکھ کر عارفِ روم درد و غم (قبض) سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں اور اس کو سالک کے لیے مفید قرار دیتے ہیں:

چونکہ قبض آمد تو دردے بطل بین تازہ باش و چیں میقلن برجیں
چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو آن صلاح تست آلیں دل مشو
(کبھی جب غم تجھے لاحق ہو جائے تو کسی بڑے درد کو یاد رکھ۔ اپنی تازگی برقرار رکھ اور تیوری مت چڑھا، جب تجھے غم آ لے اے سالک! وہ تو تیری اصلاح کے لیے ہے اس لیے تو نا امید نہ ہو۔)

اس خیال سے صوفیائے کرام نے بلا و مصیبت کو حق کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے۔ آلام محبوب بہ از انعام محبوب، بلا ہی عطا ہے اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است و از عطا ما لیدن خطا است۔

کے ز آزار تو بیزار شود جان حسین زخم چوں از تو رسد باہمہ آزار خوئیم
(آپ کے ستانے سے میری روح کہاں بے زاری کا اظہار کرتی ہے۔ آپ سے جو زخم لگے گا اس کی تکلیف کے ساتھ خوش ہیں۔)

بلا و غم جب تکفیر و تجمیص کے لیے آتے ہیں تو اس کی صاف علامت یہی ہے کہ مبتلی، جزع و فزع نہیں کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور مسایلوں کے سامنے اپنی مصیبت پیش کر کے شکوئی و شکایت نہیں کرتا۔ صبر کر کے بے حساب اجر کا امیدوار رہتا ہے۔

۱ اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لیے بھی نہیں آتی بلکہ ارتقاع درجات اور بلوغ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے جنہوں نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصفیٰ ہیں، جن میں ربط بخت قائم ہے، دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، چنانچہ البلاء للولا آزماتش دوستوں کے لیے ہوتی ہے، مشہور خاص و عام بھی ہے، اس قانون کو رازدان حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے: اذا احب اللہ عبدا ابتلاه فان صبرا اجتباہ وان رضی اصطفاہ یعنی جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لیے حضرت معروف فرمایا کرتے تھے: "لیس بصادق فی دعواہ من لم یتلذذ بضرہ مولاه"۔ جو اپنے مولا کی مار سے لذت نہیں لیتا، وہ سچا غلام ہی نہیں!

اس مفہوم کو کسی عاشق نے ان سریلے نعموں میں ادا کیا ہے:

جاں بلب آمدہ ز درد کردم از دو طلب	گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب
یار دے کہ بر سر تخی زند تو دم مزن	سربفدائے یار کن بیچ نہ خون بہا طلب
محوے مرا دیار شو تا شود او بہ کام تو!	قابل التقات نیست عاشقی مدعا طلب

(تکلیف کی وجہ سے روح نکل کر ہونٹوں پر آگئی تو میں نے دو طلب کی تو اس نے کہا اگر تو عاشق ہے صبر سے کام لے اور اس کی خوشنودی طلب کر۔ دوست ایک لمحہ کے لیے تیرے سر پر خنجر مارتا ہے تو مت چیخ، اپنا دوست کے لیے قربان کر دے اور خون بہا طلب مت کر، اپنے یار کے مقاصد میں کھوجاتا کہ وہ بھی تیرا ہو جائے۔ مقصد طلب عاشق توجہ کے قابل نہیں ہے۔)

انسان کی فطرت کے اقتضاءات و قابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ منازل عالیہ تک رسائی کے لیے درد و غم لا بدی و لازمی ہے قید جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، درد و الم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیات پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیات کیا ہے، نفس کی تحدیدات سے رہائی ہے، ذمائم اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہیں، صفات حسنہ کا پیدا کرنا مشقوں کا برداشت کرنا ہے، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفات حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں تو انسان ترفع محسوس کرنے لگتا اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد و غم کو وہ فطرتاً مکروہ سمجھتا ہے لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے کہ:

﴿عَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا﴾ ترجمہ: یعنی شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔

اولیاء پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے درجات کے ارتقاع کے لیے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ انہیں اپنا قرب عطا

کرتے ہیں، فقیر و نیستی میں انہیں مبتلا کرتے ہیں، درد و حزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ ”البلاء
کنز من کنوز الجنة لا يعطى الا بالويلاتہ“۔ عشاق بلا کی اہمیت و قیمت سے واقف ہوتے ہیں، مستانہ وار وہ اس کے
طالب ہوتے ہیں کہ:

دردہ قدح درد کہ آں می باید درد یکہ زنت بیشتر می باید
تلخ است عجب لیک بے خوشگوار است ہرچند ہی خورم دگر می باید
بفقر و نیستی یک دو روزہ حوش می باش کہ یار خود ز کرم عذر خواہ ما میگردد

(درد و زخم تو چاہیے لیکن وہ درد جو آپ کی جانب سے ہے زیادہ درکار ہے۔ وہ کڑوا ہونے کے باوجود بہت خوشگوار ہے۔
بار بار پینے کے باوجود پھر طلب رہتی ہے۔ تنگ دستی اور فقر و فاقہ کے ساتھ درد و حوش رہو کہ دوست خود ہی اپنی کرم نوازی
سے معذرت چاہے گا۔)

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر پر تو رے جاناں“ کی وجہ سے ہے، تن اگر تکلیف
میں ہو، لیکن جان جاناں کے مراد کے مطابق ہو اور اس کے جمال سے کیف اندوز، تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت، اسی
لیے بلا میں یہ عوام کالا انعام کے خلاف۔ ا۔ کسی غیر کے آگے شاکئی نہیں ہوتے اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار
نہیں کرتے کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ: انہم لن یغنوا عنک من اللہ شیئا۔

ستم کشاں محبت دم از فغاں بستند گرہ زجہ کشادند و برزباں بستند
(محبت کے ستم و خوردوں نے آہ و فغان بند کر دیا ہے پیشانی کی گرہ زبان پر باندھی ہے۔)

۲۔ اپنے باطن میں اتہام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمت بالغہ میں انہیں کوئی شک نہیں ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے
یہ خطاب سنتے ہیں:

با درد بساز چوں دوائے تو منم در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشق ما کشتہ شوی شکرا نہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

(تکلیف کا ساتھ دو کہ تیری دوا میں ہوں۔ کسی کی جانب نہ دیکھ کہ تیرا دوست میں ہوں۔ اگر ہمارے عشق کی گلی میں مارا
جائے تو شکر یہ ادا کرو کہ تیرا خون بہا میں ہوں۔)

۳۔ انہیں یقین کامل ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لیے اختیار کی وہی ان کے لیے دین و دنیا میں اچھی
ہے۔ ع: صلاح ماہمہ آنت کاں تراست صلاح

”حدیث اولیٰ“ میں اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ
ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ تو نگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہیں کر سکتی، اگر میں
اس کو فقیر کر دوں تو یہ فقیر اس کے ایمان کو بگاڑ دے اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیر و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہیں

بناسکتی، اگر میں اس کو فنی کر دوں تو غناس کے ایمان کو فاسد کر دے اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی اگر میں اس کو بیمار کر دوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے اور کوئی ایسا بھی ہے کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اس کو تندرست رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے، مجھے اپنے بندوں کے احوال سے پوری آگاہی ہے اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسن تدبیر، قضا و اختیار سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں اور ہر حال میں رضا بالعطار اور ”حفظ حال“ ضروری سمجھتے ہیں اور قلب کی گہرائیوں سے۔ ع: ہر چہ از دوست میرسد نیکوست۔ کے قائل ہوتے ہیں، اسی لیے گووہ ”طبعی“ غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن ”عقلی سرور“ سے ان کے قلب خالی نہیں ہوتے، یہ ہے ”جمع بین الاضداد“ اور ”ضدوں کی جمع کا یہ ہنر“، ان ہی کو آتا ہے! رضی ائ عنہم و رضوانہ۔

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ۔ ع: عالم ہمہ درداست و دوائی خواہد۔ یہ درد یا تو گناہوں اور بدکرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لیے وارد ہوتا ہے، یا رفع درجات کے واسطے عائد کیا جاتا ہے، بہر حال: ﴿لقد خلقنا الانسان فی کبد﴾ ”ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا“..... کے کلی قانون کا کوئی استثناء نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ، غم و اندوہ میں گزرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بے قرار کے مانند ہے، جس کی ماسیت ہی میں بیچ و تاب ہے۔ چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے:

چہ پرسى از کجايم چيست من؟ بخود بيچيده ام تازيستم من
درين دريا چو موج بيقرارم اگر بر خود نه پيچم شيستم من

”کیا پوچھتے ہو، کہاں سے ہوں اور کہاں جاؤں؟ اپنے میں الجھ گیا ہوں یہاں تک کہ زندہ رہا ہوں۔ اس سمندر میں موج بے قرار ہوں اگر اپنے ساتھ الجھ کر نہ ہوں تو پھر میرا وجود نہ رہے گا۔“

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا ہے وہ درد و غم، سوز و الم بے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوت حیات کی توفیر ہے، اسی مقصد کو پیش نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف رومی نے فرمایا تھا:

چوں بدانستی کہ ظل کیستی فارغی گر مردی و گر زیستی
قطرہ نوری سراپا نور باش بگذر از غم انما سرور باش

(جب جان لوگے کہ تو کس کا سایہ ہے تو پھر (غموں سے) فارغ ہے کہ جیسے یا مرے۔ تو نور کا ایک قطرہ ہے سراپا نور رہو۔ غموں کو چھوڑ کر ہمیشہ خوش رہو۔) فافہم و تدبر!